اردو میں نقد افسانہ کی روایت

محمد نجم الحسن عارض

ریسرچ اسکالر، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

رابطہ:9386128692

ملخص

اردو میں نقد افسانہ کی راویت کو آگے بڑھانے میں قمر رئیس نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔قمر رئیس تنقید کا ایک اہم نام ہے۔افسانے کی تنقید سے متعلق پہلی کتاب، پریم چند: شخصیت اور کارنامے، ۱۹۶۲ میں منظر عام پر آئی۔ان کی دوسری کتاب پریم چند ہی پر پریم چند: فکر وفن کے نام سے ۱۹۸۰ میں شائع ہوئی جب کہ اس کے دوسال بعد یعنی ۱۹۸۲ میں، راجندر سنگھ بیدی نمبر، (عصری آگہی) ترتیب دی۔ اسکے بعد ۱۹۸۰ میں، آزادی کے بعد دہلی میں اردو افسانہ، کے نام سے ان کی کتاب شائع ہوئی۔بھر نیا افسانہ: مسائل اور میلانات، ۱۹۹۲ میں منظر عام پر آئی۔اس طرح قمر رئیس نے اردو افسانے کی تنقید کو مستحکم کرنے میں نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔پریم چند اردو کے پہلے افسانہ نگار تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن ان کی حیثیت محض تاریخی نہیں ہے کیوں کہ وہ نہ صرف پہلے افسانہ نگار ہیں بلکہ قلم کے سپاہی بھی مانے جاتے ہیں۔انہوں نے افسانے کو فن کی بلندیوں پر پہنچایا ہے۔ایسے میں ان کے افسانوں سے متعلق قمر رئیس کی یہ تنقید کی کاوش بڑی اہمیت کی حامل ہے۔قمر رئیس پریم چند کے اہم نقاد تسلیم کئے جاتے ہیں۔اس سلسلے میں قمر رئیس نے، پریم چند: شخصیت اور کارنامے، لکھ کر نہ صرف پریم چند کی افسانہ نگاری کی دنیا میں عظیم خدمات کو اجاگر کیا بلکہ افسانے کی تنقید کی روایت کو راہ پر لگایا۔

اردو میں نقد افسانہ کی روایت

اردو میں افسانے کی تاریخ بہت قدیم نہیں ہے۔خود افسانہ ایک ایسی صنف ہے جس کا آغاز بیسویں صدی کے اوائل میں ہوا۔ پریم چند کو پہلا افسانہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہاں ہمارا مقصد کسی کے سر اولیت کا سہرا باندھنا نہیں ہے، دراصل یہ دکھانا اور بتانا مقصود ہے کہ اردو افسانے کی عمر سوسوا سو سال سے زیادہ نہیں ہے۔ پہلا افسانہ نگار خواہ کوئی بھی اردو افسانے کے وقت پیدائش میں زیادہ فرق نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ جن افسانہ نگاروں کے درمیان افسانے کی اولیت کی بات ہوتی ہے وہ ایک ہی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہر حال یہ بات یہیں طے ہو جاتی ہے کہ اردو افسانہ کی تنقید کی مدت بھی زیادہ نہیں ہے۔اردو افسانے پر پہلی کتاب عبدالقادر سروری کی تسلیم کی جاتی ہے جو 'دنیائے افسانہ' کے نام سے ۱۹۲۷ میں منظر عام پر آئی۔لیکن اردو میں تنقید کی طرح اردو افسانہ کی تنقید کے ابتدائی نقوش اس کتاب سے پہلے بھی تلاش کئے جاسکتے ہیں ۔اور اس کے نمونے رسائل و جرائد میں موجود ہیں۔اردو افسانے کا آغاز علامہ راشد الخیری کے افسانہ، نصیر اور خدیجہ، مطبوعہ ۱۹۰۳ سے تسلیم کیا جائے تو افسانے پر پہلی تنقیدی کتاب ۱۹۲۷ میں آئی۔اس طرح صنف افسانہ وجود میں آنے اور اس پر تنقید لکھے جانے کے درمیان کم و بیش چوبیس پچیس سال کا وقفہ ہے۔ یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اس درمیان میں افسانے کے تعلق سے کچھ نہ لکھا گیا ہو۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ اردو افسانے پر تنقید کی روایت خود افسانہ نگاروں نے ہی شروع کی اور تحقیق کے مطابق یہ کام بھی پریم چند نے ہی انجام دیا۔اس سے قبل کہ کتابوں کے حوالے سے فکشن کی تنقید کے خدوخال تلاش کئے جائیں، آئے دیکھتے ہیں کہ پریم چند نے اس سلسلے میں کیا کام کیا ہے۔

پریم چند نے باضابطہ طور پر تنقید کا فریضہ انجام نہیں دیا البتہ کچھ ایسے مضامین اور کتابوں کے دیباچے ان کے تنقیدی شعور کا پتہ دیتے ہیں۔مثلاً مشہور ناول، سوز وطن، جسے انگریز حکومت نے ضبط کر لیا اس کا دیباچہ پریم چند جیسے فنکار میں تنقیدی شعور کا اشاریہ ہے۔اس کے علاوہ میں افسانہ کیوں لکھتا ہوں، میرے

بہترین افسانے اور ہماری قوت بیانیہ کا زوال وغیرہ اس سلسلے میں دیکھے جاسکتے ہیں۔، میرے بہترین افسانے، کا عنوان بذات خود اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ پریم چند نے اگر اپنے افسانے کا انتخاب کیا ہے تو گویا اس کا کوئی معیار بھی رہا ہوگا۔ان کی پسند اور ناپسند کی کوئی وجہ رہی ہوگی۔یہیں سے اس بات ثبوت ملتا ہے کہ پریم چند نے جب افسانے کا فن لکھنا شروع کیا تو اس فن کے تعلق سے ان کا کوئی نظریہ بھی رہا ہوگا۔ان کے مضامین، مختصر افسانہ، اور مختصر افسانے کا جن تو براہ راست جن افسانہ سے تعلق رکھتے ہیں ۔علاوہ ازیں، راشد الخیری کے افسانے، ایسا مضمون ہے جس کی بنیاد تنقید پر رکھی گئی ہے۔ان مضامین سے نہ صرف پریم چند کے تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے بلکہ اردو فکشن کے ابتدائی نقوش بھی واضح ہوتے ہیں۔

پریم چند کے عہد میں دوسرے ادبا بھی اس جانب قدم بڑھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔البتہ یہ مضامین ، دیباچے اور مقدمے کی صورت میں ہیں۔خود پریم چند کے افسانوی مجموعے، پریم بتیسی، جو ۱۹۲۵ میں شائع ہوا امتیاز علی تاج نے اس پر مقدمہ لکھا تھا۔ پریم چند کی افسانہ نگاری پر امتیاز علی تاج کا یہ مقدمہ افسانے کی تنقید میں ایک اہم کڑی جوڑتا ہے۔ناقدین نے اسے پریم چند کی افسانہ نگاری کی پہلی تنقید قرار دیا ہے۔معروف نقاد پروفیسر ارتضیٰ کریم اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

> ،،۔۔۔۱۹۲۵ میں پریم بتیسی کی دوسری اشاعت پر اس افسانوی مجموعے پر امتیاز علی تاج نے مقدمہ لکھا تھا۔ یہ پریم چند کے افسانوں پر پہلی تنقید بھی کہی جاسکتی ہے جس میں انہوں نے پریم چند کے افسانوں پر گفتگو کی ہے۔۔۔۔اس جائزے سے اردو افسانے کی تنقید کی تاریخ کے ارتقا پر روشنی پڑتی ہے اور یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اردو میں افسانے کی تنقید کی تاریخ نہایت مختصر ہے۔ اس ارتقائی سفر میں پریم چند کی تحریریں اولیت کا حکم رکھتی ہیں۔،،

بہر کیف امتیاز علی تاج کے علاوہ فن قصہ نویسی کے عنوان سے ضیاء الدین شمسی کا مضمون رسالہ، ہمایوں مئی تا نومبر ۱۹۲۲، شمسی ہی کا مضمون، کہانی کا سفر نیرنگ خیال جون ۱۹۳۱، فن افسانہ نگاری کے عنوان سے عبدالقادر سروری کا مضمون جو، نگار، میں ۱۹۲۶ میں شائع ہوا یا حسیب احمد صدیقی کا مضمون، افسانہ کی

مہیت، رسالہ، ہمایوں نومبر ۱۹۲۷ محمد حسین کا مضمون عہد حاضر کے افسانہ نگار مطبوعہ نگار ۱۹۳۴، عظیم بیگ چغتائی کا مضمون، افسانہ نویسی، جوساقی، میں جنوری ۱۹۳۵ میں شائع ہوا اور عظیم بیگ چغتائی ہی کا دوسرا مضمون، افسانہ نگاری کی قسمیں، جوساقی ہی میں ۱۹۳۵ میں شائع ہوا ایسے مضامین ہیں جو افسانہ نگاری کے خدوخال متعین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان مضامین میں افسانے کی ماہیت سے لے کر اس کے لئے مواد کی فراہمی کے مسئلے اور افسانہ نگاری کی قسمیں تک کی باتیں کی گئی ہیں۔ ساتھ ہی اس سلسلے میں عبد القادر سروری کا مضمون، جن افسانہ نگاری، افسانے کے فن پر ابتدائی دور کا ایک اہم مضمون ہے۔ جہاں تک اردو افسانے کی تنقید کی کتابی صورت کا سوال ہے گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا کہ عبدالقادر سروری کی کتاب، دنیائے افسانہ، اب تک کی پہلی معلوم کتاب ہے۔ اس کتاب میں سروری نے افسانے کے اصول تو متعین نہیں کئے البتہ اس جانب ادبا کی توجہ مبذول کرائی ہے کہ افسانے کے فن کے سلسلے میں مغرب سے استفادہ بھی ضروری ہے۔ ظاہری بات ہے افسانہ خود ابتدائی مرحلے میں تھا۔ اس کے لئے باضابطہ طور پر کوئی اصول متعین ابھی نہیں کیا گیا تھا۔ ہاں افسانے لکھے جارہے تھے۔ اور افسانہ نگاروں کے سامنے مغرب کے افسانے بطور نمونہ موجود رہے ہوں گے۔ جس سے کم از کم یہ اندازہ تو رہا ہوگا کہ افسانے میں ناول کی طرح کردار نگاری، پلاٹ اور منظر نگاری وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح جو افسانے لکھے جارہے تھے ان میں مغرب میں افسانہ نگاری کے اصول کو برتا جارہا تھا۔ چونکہ ناول کی طرح اردو افسانہ بھی مغرب سے آیا ہے اس لئے اس کے اصول ضوابط پر مغرب کا اثر بھی رہا ہے۔ شاید اسی کی روشنی میں عبد القادر سروری نے افسانہ نگار کے کچھ اصول بتانے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں، دنیائے افسانہ، کی جلد دوم، کردار اور افسانہ دیکھی جاسکتی ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

> ،، جو اشخاص قصہ پورے ناول میں موجود ہوتے ہیں وہ مستقل اشخاص قصہ کہلاتے ہیں۔ پلاٹ کتنا ہی غیر منتظم اور غیر دلچسپ کیوں نہ ہو اس میں کم سے کم مستقل شخص قصہ موجود ہوگا وہ قصہ در قصہ والے پلاٹ کے مختلف اجزا میں ایک رشتہ کا کام دیتا ہے۔،،

اس اقتباس واضح ہوتا ہے کہ ایک افسانے میں شخص قصہ، کا ہونا ضروری ہے، خواہ پلاٹ کمزور اور غیر دلچسپ ہی کیوں نہ ہو۔ ظاہری بات ہے کہ بغیر کردار کے افسانے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ عبدالقادر سروری کردار نگاری پر زور دیتے ہوئے بجا طور پر کہتے ہیں کہ شخص قصہ کو ہونا لازمی ہے۔ لیکن ان کا رخ صرف اس جانب ہے کہ وہ، شخص قصہ، قصہ در قصہ والے پلاٹ کے مختلف اجزا میں ایک رشتہ قائم کرتا ہے۔ حالانکہ شخص قصہ افسانے کا لازمی جزو ہے لیکن ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ابتدائی دور میں طویل افسانے بھی لکھے جاتے تھے جس میں مختلف اجزا ہوتے تھے۔ بہر حال عبدالقادر سروری کی اس رائے سے اتنا واضح ہو جاتا ہے کہ اردو فکشن کی تنقید میں انہوں نے باضابطہ طور پر پہلا قدم بڑھایا تھا، اس کے باوجود کہ موصوف نے کردار نگاری کے حوالے سے گفتگو پر توجہ نہیں دی ہے۔ اس کا ذکر کم ہوا ہے۔ وہ زیادہ تر مثالیں داستان اور مثنوی سے فراہم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ افسانے کے کرداروں کے تعلق سے زیادہ مواد فراہم نہ کر سکیں ہوں۔ ورنہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کتاب کو عنوان، کردار اور افسانہ، ہونے کے باوجود ان کا رخ مثنوی اور داستان کی طرف کیوں ہو جاتا ہے؟ حقیقت تو یہی ہے کہ اس عہد میں نہ تو اردو افسانہ اتنا توانا تھا اور نہ ہی اردو تنقید اس قابل تھی کہ فن کی موشگافیاں وا کر پاتی۔

عبدالقادر سروری افسانے کے حوالے سے قدیم و جدید کی بحث بھی کرتے ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ :،، قدیم افسانہ نگاری کا اصول تصورت (idealism) تھا اور موجودہ افسانے حقیقت (realism) کے اصول پر لکھے جاتے ہیں۔،،

کچھ یہی حال اسی عہد سے تعلق رکھنے والے مجنوں گورکھپوری کی تنقید کا بھی ہے۔ انہوں نے، افسانہ اور اس کی غایت، کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ۱۹۳۵ میں منظر عام پر آیا۔ کتاب کے عنوان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مصنف نے اس میں اردو افسانے کے تعلق سے خاطر خواہ بحث کی ہوگی۔ اس میں انہوں نے افسانے کے اجزا بیان کئے ہیں۔ مثلاً افسانے کے واقعات کو افسانے کی بنیاد قرار دینا اور یہ بتانا کہ ان واقعات کی ترتیب کو پلاٹ کہتے ہیں۔ انہوں نے افسانے کے لئے دوسری اہم چیز دلچسپی بتائی ہے اور تیسری چیز زمانہ، ماحول اور معاشرت کے مطابق واقعات کا ہونا۔ حالانکہ افسانے کے کچھ اور اجزا ہو سکتے

تھے جس جانب توجہ نہیں دی گئی۔ کردار نگاری کے تعلق سے انہوں نے یہ رقم کیا ہے کہ اردو افسانے میں کردار نگاری کوئی مرتبہ حاصل نہیں کر سکی ہے۔ وجہ یہ بتائی ہے کہ اردو افسانے میں کردار نگاری کے نام پر مغربی افسانے کی روشنی ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے ایک اور اہم بات کہی ہے۔ وہ ہے افسانہ نگار کا نقطۂ نظر۔ در اصل افسانے میں اس کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ افسانے میں سب کچھ نقطہ نظر ہی نہیں ہوتا۔ اس کا احساس مجنوں گورکھپوری کو بھی تھا اس لئے وہ اس کے ساتھ ہی فنکاری کی بھی بات کرتے ہیں اور یہ شکوہ بھی کرتے ہیں کہ افسانہ کے فرائض کو بعض افسانہ نگاروں نے پوری طرح انجام نہیں دیا ہے۔ انہی باتوں کے پیش نظر مجنوں گورکھپوری نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے کہ ادب عالیہ میں ایسے افسانہ نگاروں کے لئے کوئی جگہ نہیں جو زندگی سے متعلق کوئی نقطہ خیال نہ رکھتے ہوں۔

مجنوں گورکھپوری افسانے میں اسلوب اور اظہار کی بات بھی کرتے ہیں اور مقصد پر بھی روشنی ڈالتے ہیں منجملہ یہ بات ہی کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے افسانے کے خدوخال کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

طرح مجنوں گورکھپوری اردو افسانے کے ایک ایسے ناقد کے طور پر سامنے آتے ہیں جس نے بھرپور طور پر نہ سہی کم از کم اس کے فن کی جانب تنقیدی کاوش تو کی ہے۔ وہ زیادہ تر سرسری طور پر تنقید کی نظر ڈالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں افسانے کی باریکیاں اور اس کے فن کی گتھیاں بھی سلجھاتے ہیں اس کے باوجود ان کی تنقید ابتدائی نقوش ہی ٹھہرتی ہے۔

اس کے بعد ایک ایسا نام سامنے آتا ہے جو آج بھی اردو افسانے کی تنقید میں حوالے بنتا رہا ہے۔ میری مراد وقار عظیم سے ہے۔ وقار عظیم ایک ایسا نام ہے جس نے، داستان سے افسانے تک، نامی کتاب لکھ کر وہ کارنامہ انجام دیا کہ جس کے ذکر کے بغیر آج بھی اردو افسانے سے متعلق کوئی تنقید مکمل نہیں ہوتی۔ وقار عظیم کی اس کتاب میں افسانے سے متعلق دس مضامین شامل ہیں۔ ان میں داستانی عہد کی کہانیاں، ہمارے مختصر افسانے میں زندگی اور فن کا امتزاج، مختصر افسانے میں روایت اور جدت، مختصر افسانے کے پچیس سال، پریم چند کے افسانوں کا پہلا مجموعہ، منٹو کا فن، تقسیم کے بعد منٹو کے افسانے، تقسیم کے بعد افسانہ، افسانہ نگاروں کی نئی پود اور ایک کتاب سے موسم، داستان سے افسانے تک، ایسے مضامین ہیں

جو وقیع اور گراں قدر معلوم ہوتے ہیں ۔ یہ کتاب آزادی کے برسوں بعد یعنی ۱۹۶۰ میں منظر عام پر آئی جب جدیدیت کا دور شروع ہو رہا تھا۔ان مضامین کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وقار عظیم نے اس تعلق سے ایک منظّم کاوش کی ہے۔انہونے افسانے کے خدوخال تلاش کئے اور یہ بھی پتہ لگانے کی کوشش کی ہے کہ افسانے کے ابتدائی دور میں اس پر داستان کے اثرات رہے ہیں یا نہیں۔ان کے مضمون، داستان سے افسانے تک، اس سلسلے کی کڑی ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ مختصر افسانے پر داستان کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔انہوں نے پریم چند کے افسانوں پر بھی اسکے اثرات کی تلاش کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''ہمارے مختصر افسانہ کے ابتدائی دور میں واضح طور پر داستان کی دلکش روایت کا عکس جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔''

اردو کے سب سے پہلے افسانہ نگار پریم چند کے مختصر افسانوں کے کئی ابتدائی مجموعے، سوز وطن،، پریم پچیسی اور پریم اوران میں نمایاں طور پر ۔

''انگارے کے افسانے''اس ذہنی اور باغیانہ روش کے علمبردار جس کے بغیر فن میں نئی راہوں کا کھلنا بند ہو جاتا ہے۔جب کہ دوسری زبانوں سے اردو میں افسانے کے ترجمے کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں : ہمار افسانہ نگاروں نے دوسری زبانوں کے افسانے اردو میں منتقل کر کے اردو میں افسانہ کو فن کی ان نزاکتوں اور لطافتوں سے روشناس کرایا، جن تک ہنوز اس کی رسائی نہیں ہوئی تھی ۔ایسے ترجمہ کرنے والوں میں محمد مجیب؛ خواجہ منظور، متصور احمد اور جلیل قدوائی کے نام اہم ہیں۔ان ترجمہ کرنے والوں کے ساتھ لکھنے والوں کا ایک گروہ بھی نظر کے سامنے آتا ہے، جس نے مغربی شاہکاروں سے متاثر ہو کر ایسے طبع زاد افسانے لکھے جو زندگی اور فن کے امتزان کے موثر اور دلکش نمونے ہیں۔۔۔حیات اللہ انصاری، اختر انصاری، سجاد ظہیر، اختر حسین رائے پوری، احمد علی اور فیاض محمود۔۔۔وقار عظیم نے اردو افسانے کا مرحلہ وار جائزہ لیا ہے اور نتیجے بھی اخذ کئے ہیں۔وہ ۱۹۴۶ سے ۱۹۴۷ کے درمیان لکھے گئے افسانوں کو اہم قرار دیتے ہوئے فنی عروج کا بہترین زمانہ قرر دیتے ہیں۔اس سلسلے میں یہ اقتباس بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے ۔موصوف رقم طراز ہیں، ۱۹۳۶ سے ۱۹۴۷ کا زمانے ہمارے مختصر افسانوں کی زندگی کے شباب اور اس کے فنی عروج کا بہترین زمانہ ہے۔۔۔اس دور کے افسانہ نگاروں میں علی ہے نہ زندگی کی ۔وقار عظیم کی تنقید

میں بہت گہرائی اور گیرائی نہیں پائی جاتی بلکہ بعض افسانوں کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے وہ یکسانیت کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔اس کے باوجود اردو افسانے کی تنقید کا وہ سنگ میل قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

اردو میں نقد افسانہ کی راویت کو آگے بڑھانے میں قمر رئیس نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔قمر رئیس تنقید کا ایک اہم نام ہے۔افسانے کی تنقید سے متعلق پہلی کتاب، پریم چند: شخصیت اور کارنامے، ۱۹۶۲ میں منظر عام پر آئی۔ان کی دوسری کتاب پریم چند ہی پر پریم چند: فکر وفن کے نام سے ۱۹۸۰ میں شائع ہوئی جب کہ اس کے دوسال بعد یعنی ۱۹۸۲ میں، راجندر سنگھ بیدی نمبر، (عصری آگہی) ترتیب دی۔ اسکے بعد ۱۹۸۰ میں، آزادی کے بعد دہلی میں اردو افسانہ، کے نام سے ان کی کتاب شائع ہوئی۔بھر نیا افسانہ: مسائل اور میلانات، ۱۹۹۲ میں منظر عام پر آئی۔اس طرح قمر رئیس نے اردو افسانے کی تنقید کو مستحکم کرنے میں نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔پریم چند اردو کے پہلے افسانہ نگار تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن ان کی حیثیت محض تاریخی نہیں ہے کیوں کہ وہ نہ صرف پہلے افسانہ نگار ہیں بلکہ قلم کے سپاہی بھی مانے جاتے ہیں ۔انہوں نے افسانے کو فن کی بلندیوں پر پہنچایا ہے۔ایسے میں ان کے افسانوں سے متعلق قمر رئیس کی یہ تنقید کی کاوش بڑی اہمیت کی حامل ہے۔قمر رئیس پریم چند کے اہم نقاد تسلیم کئے جاتے ہیں۔اس سلسلے میں قمر رئیس نے، پریم چند: شخصیت اور کارنامے، لکھ کر نہ صرف پریم چند کی افسانہ نگاری کی دنیا میں عظیم خدمات کو اجاگر کیا بلکہ افسانے کی تنقید کی روایت کو راہ پر لگایا۔بہر کیف درج بالا کتاب پریم چند سے متعلق مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔اس میں کچھ ایسے مضامین ہیں جو افسانے کی تنقید سے تعلق رکھتے ہیں۔یہ مضامین وقار عظیم، عبدالماجد دریا آبادی، مسعود حسین، فراق گورکھپوری، علی جواد زیدی، آغا عبدالحمید اور شکیل الرحمان کے تحریر کردہ ہیں۔ان مضامین میں بھی پریم چند کے فن سے متعلق ہی بحث کی گئی ہے۔تنقید کا یہ انداز تاثراتی ہے اور عقیدت کا رنگ غالب ہے لیکن یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ اس دور کی تحریریں ہیں جب اردو تنقید اپنے ابتدائی مراحل میں تھی اور تاثراتی تنقیدیں زیادہ لکھی جارہی تھیں ساتھ ہی تنقید کا کوئی منظّم ضابطہ اور اصول موجود نہیں تھا۔ابتدائی نقوش میں قمر رئیس یہ یہ کاوش ایک اہم تنقیدی کارنامہ تصور کی جاتی ہے۔قمر رئیس ایک ترقی ایک ترقی پسند ناقد اور شاعر تھے۔انہوں نے اپنی تنقید میں بڑی کاوش کی ہے اور ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ وہ کسی ازم سے بالاتر نظر آتے ہیں۔ان کے نقد ونظر کے تعلق سے گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر وہاب اشرفی کہتے ہیں۔

۔۔۔موصوف (قمر رئیس) کا غالب رجحان افسانے کی تنقید کی طرف ہے دراصل قمر رئیس ترقی پسندوں میں ایک امتیاز یہ بھی رکھتے ہیں کہ انہوں نے بڑی یکسوئی سے افسانے میں یا فکشن میں زندگی کے خدوخال تلاش کئے ہیں۔ان کی حقیقت پسندی زندگی اور سماج کے نشیب وفراز کی تفہیم سے عبارت ہے۔نتیجے میں ان کے یہاں ایک ایسا شعور جھلکتا ہے جس میں انسانی ہمدردی کی عام فضا ہے۔ایسی ہی فضا کے تحت وہ استحصال کے تمام پہلوؤں کو رد کرتے ہیں اور طبقات کی تقسیم کو لایعنی بنا کر انسانیت کی اعلیٰ قدروں کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔۔۔دراصل قمر رئیس پریم چند سے بے حد متاثر تھے،انہوں نے پریم چند پر بھرپور کام بھی کیا۔پریم چند کے افسانوں میں جو انسانی ہمدردی ہے قمر رئیس اس کے قائل ہیں۔یہی چیز ترقی پسندوں کے یہاں بھی نظر آتی ہے لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ قمر رئیس افراط وتفریط کے شکار نظر نہیں آتے۔ان کے تنقیدی مضامین کے دو مجموعے تنقیدی تناظر اور تلاش وتوازن بھی بے حد اہم ہیں۔

تنقید سے عموماً خواتین کا تعلق کم ہی ہوتا ہے لیکن ممتاز شیریں نے اس میدان میں ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جس سے اردو ادب کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔اسی بنا پر وہ اردو فکشن کی تنقید کا معتبر نقاد تصور کی جاتی ہیں۔ممتاز شیریں نے تنقید کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ان کی کتاب معیار کے نام سے ۱۹۶۳ میں منظر عام پر آئی۔یہ مضامین کا مجموعہ ہے۔اس کتاب کے سلسلے میں موجودہ دور میں اردو تنقید کے اہم نام ارتضیٰ کریم نے لکھا ہے کہ،، اس مجموعے کا نام معیار صرف نام کی حد تک معیار نہ تھا بلکہ اس کے پس پشت مضمون نگار کی پوری فکر کارفرما ہے کہ آئندہ یہ مضامین اردو فکشن کی تنقید کا معیار قرار پائیں گے۔دراصل ممتاز شیریں کی یہ کتاب کچھ اس نوعیت کی ہے کہ اس سے تنقیدی فکر ونظر کو جلا ملتی ہے۔ممتاز شیریں نے اپنی تنقید کے ذریعے نہ صرف اردو فکشن کی تنقید کا معیار بلند کیا اس کی روایت کو تقویت بخشی ہے۔ممتاز شیریں نے اس کتاب میں مغربی ادب کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور منٹو کی افسانہ نگاری سے بھی بحث کی ہے اس کے ساتھ ہی انہوں نے افسانے کے فن سے بھی قابل قدر گفتگو کی ہے۔فن پارے کے لئے مواد اور تکنیک اہم ہوتی ہے اور اس حوالے سے گفتگو بھی ہوتی رہی ہے۔ممتاز شیریں اس پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:،،صرف اچھا مواد یا اچھی تکنیک کسی افسانے کو اچھا نہیں بنا سکتی۔کامیاب فنکار ہر طرح کے موضوع سے ایک اچھا افسانہ تخلیق کرسکتا ہے۔۔۔تکنیک کے مطابق یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ فلاں تکنیک قطعی بہترین ہے، کیوں کہ ایک خاص مواد، ایک خاص تکنیک

میں ڈھل کر زیادہ موثر ہوجاتا ہے کہ لیکن اسی مواد کی دوسری تکنیک میں ڈھل جانے سے سارا اثر زائل ہوجاتا ہے۔

اسی عہد میں ایک اور نام اردو افسانے کی روایت کو میں آگے بڑھانے میں میں معاون ومد ثابت ہوتا نظر آتا ہے۔اور وہ ہیں مولانا صلاح الدین احمد۔صلاح الدین احمد تنقید اردو افسانے کی تنقید کے معماروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ان کے مضامین کا مجموعہ،صریر خامہ کے نام سے ۱۹۶۹ میں شائع ہوا ۔واضح رہے کہ اسی سال وقار عظیم کی کتاب،فن افسانہ نگاری،بھی منظر عام پر آئی تھی۔مولانا صلاح الدین احمد کی اس کتاب میں شامل ۔مضامین مختلف جرائد ورسائل میں شائع ہوتے رہے تھے ۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۰ سے شروع ہوا تھا۔بعدازاں اسے کتابی شکل دی گئی۔مولانا صلاحالدین احمد،ادبی دنیا، کے نام سے رسالہ نکالتے تھے اس میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے۔مولانا کا طرز تنقید انہیں اہم بناتا ہے۔وہ ادب برائے ادب کے نظریے کے قائل تھے اور افسانے کے فن سے بخوبی آگاہ تھے۔

سلیم اختر اردو افسانے کی تنقید کا ایک معتبر نام ہے۔ان کی کتاب،افسانہ:حقیقت سے علامت تک،۱۹۸۰ میں شائع ہوئی جو مضامین کا انتخاب ہے اور اس میں داستان،ناول اور افسانے پر مضامین شامل ہیں۔ان کی دوسری کتاب،افسانہ اور افسانہ نگار ۱۹۹۱ میں شائع ہوئی۔سلیم اختر کو بنیادی طور نفسیاتی نقاد تسلیم کیا جاتا ہے اور اس کے ثبوت بھی ملتے ہیں۔ان کی ایک کتاب کا نام،جوش کا نفسیات مطالعہ ہے لیکن اس کے قطع نظر افسانے کی تنقید سے متعلق ان کی کاوش بھی قابل ذکر ہے۔سلیم اختر کو اس بات کا احساس تھا کہ اردو افسانے کی تنقید میں اب تک خاطر خواہ کچھ نہیں لکھا گیا۔،افسانہ:حقیقت سے علامت تک میں وہ لکھتے ہیں:موجودہ تنقیدی گرم بازاری میں افسانہ نگاروں اور افسانے کے فن پر باضابطہ تصانیف بہت کم ہے یہ کتاب اسی توقع سے پیش کی جارہی ہے کہ شاید یہ مضامین مزید تنقیدی تحریروں کے لئے محرک ثابت ہوسکیں۔

اردو افسانے کی تنقید پر مشتمل کم ازکم چار کتابیں ۱۹۸۱ میں عام پر آئیں۔ان میں سب سے اہم کتاب گوپی چند نارنگ کی اردو افسانہ:روایت اور مسائل ہے،جبکہ ترقی پسند تحریک کی بازیافت کرتی ہوئی صادق کی کتاب،ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ،بھی اسی سال شائع ہوئی۔اس کے علاوہ ش اختر کی شناخت اور مہدی جعفر کی نئے افسانے کا سلسلۂ عمل،بھی زیور طبع سے آراستہ ہوکر قاری کے ہاتھوں میں

پہنچی ۔ گوپی چند نارنگ اردو تنقید کا بڑا نام ہے ۔ انہوں نے متعدد کتابیں اردو ادب کو دی ہیں ۔ ان کی کتاب اردو افسانہ، روایت اور مسائل، ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۰ کے اردو افسانہ سمینار میں پڑھے گئے ۔ دیگر مضامین سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف گوپی چند نارنگ کے مضمون پر غور کریں تو افسانے سے متعلق کئی مسائل ہمارے سامنے آتے ہیں ۔ گوپی چند نارنگ نے اس جانب توجہ دلائی تھی، حالانکہ یہ جدیدیت پر ایک ضرب بھی تھی تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نارنگ نے روایت سے انحراف اور علامتی استعاراتی انداز کو بہ نظر استحسان دیکھا ہے ۔ اپنے مضمون، نیا افسانہ: روایت سے انحراف اور مقلدین کے لئے لمحہ فکریہ،، میں وہ لکھتے ہیں : جو بات تشویش ناک ہے، وہ اوسط درجے کی ذہنیت Mediocrity کی یلغار ہے جس کے باعث علامتی اور تمثیلی کہانی کے مقلدین کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ ان کے ہاتھوں اس کہانی کے مستقبل کو شدید خطرہ درپیش ہے ۔ اب علامتی تمثیلی کہانی بھی ایک فیشن اور فارمولا بن گئی ہے اور بہت سے نئے لکھنے والوں نے اسے رواجاً اختیار کر رکھا ہے ۔ اس سے نئے لکھنے والوں کی تخلیقیت اور نئی کہانی دونوں کو نقصان پہنچا ہے ۔ یہاں قارئیں کو مغالطہ ہونے کا امکان ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسے غلط سمجھا بھی گیا لیکن ایسا نہیں ہے کہ نارنگ روایت کے مخالف ہیں بلکہ روایت کے ساتھ وہ تازہ ہوا کے لئے کھڑکیاں کھلی رکھنا چاہئے ہیں ۔ خاتون افسانہ نگاروں کے تعلق سے یہ ایک اہم کتاب ہے ۔ اس میں حجاب امتیاز علی، مسز عبدالقادر، ڈاکٹر رشید جہاں، عصمت چغتائی، صالحہ عابد حسین، ممتاز شیریں، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، شکیلہ اختر، تسنیم سلیم چھتاری، جیلانی بانو، قرۃ العین حیدر، صدیقہ بیگم سیوہاردی اور سرلا دیوی کے فکر و فن پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ ساتھ ہی ان کی شخصیت کا بھی احاطہ کیا گیا ہے ۔ اس طرح یہ خاتون فنکاروں پر ایک کامیاب کتاب ہے ۔ یہیں پر ڈاکٹر صادق کا ذکر کیا جانا چاہئے ۔ ان کی کتاب، ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ، ۱۹۸۱ میں منظر عام پر آئی تھی ۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے صادق نے اس کتاب میں ترقی پسند افسانہ نگاری پر نظر ڈالی ہے ۔ اور بقول صادق کے انہوں نے اس تحریک کے تحت لکھے گئے افسانوں کا معروضی مطالعہ پیش کیا ہے ۔ ترقی پسند تحریک اردو کی ایک توانا تحریک تھی ۔ اور اس کے زیر اثر بڑے پیمانے پر ادب تخلیق کیا گیا ۔ شاعری کے ساتھ افسانے اور ناول بھی لکھے گئے اور تنقید بھی کی گئی ۔ ترقی پسند تنقید کا ایک اپنا مزاج اور نہج ہے ۔ صادق نے ترقی پسند تحریک کے حوالے سے جن افسانوں کا تجزیہ کیا ہے ظاہر ہے کہ وہ اسی مدت میں لکھے گئے ہیں یعنی ۱۹۳۵ سے لے کر

۱۹۵۶ کے درمیان جو افسانے لکھے گئے وہی ان کا مقصود ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ موصوف نے جس معر وضی مطالعے کی بات کی ہے اس میں وہ کتنا کامیاب نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی کتاب سے یہ اقتبا س ملاحظہ فرمائیں:،، دراصل اردو افسانہ ایک نئی زندگی سے اس وقت رابطہ قائم کرتا ہے وہ جب ۱۹۳۲ میں انگارے نام کے افسانوی مجموعے کی اشاعت عمل میں آتی ہے۔ انگارے اردو افسانے کی تاریخ کا ایک ہم سنگ میل ہی نہیں بلکہ ایک زبردست انقلاب بھی ہے۔

افسانے کی تنقید کی روایت میں مہدی جعفری، نئے افسانے کا سلسلۂ عمل، کے ساتھ ۱۹۸۱ میں منظر عام پر آئے۔ یہ کتاب مضامین پر مشتمل ہے۔ جن میں ۱۸ مضامین شامل ہیں۔ سات مضامین موضوعات و مسائل سے متعلق ہیں جب کہ گیارہ مضامین ان کے مطالعے پر مشتمل ہیں۔ یہ کتاب نئے افسانہ کے عمل کے سلسلے میں ہے لیکن صاحب کتاب کی کوتاہ نظری کے سبب افراط کا شکار ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو افسانہ کی تنقید کی روایت کے سلسلے میں اس کا ذکر تو ہوسکتا ہے۔ اردو افسانے کی راویت کو آگے بڑھانے میں شمس الرحمان فاروقی، وہاب اشرفی، فرمان فتح پوری، انور سدید، رام لعل، وارث علی، محمد محسن، سید عاشور کاظمی، شکیل الرحمان اور علی احمد فاطمی نے بڑا کام کیا ہے۔ شمس الرحمان فاروقی اردو میں جدیدیت کے رجحان کو فروغ دینے میں میر کارواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا تعلق براہ راست تنقید سے ہے حالانکہ انہوں نے ناول بھی لکھا ہے اور شاعری بھی کی ہے۔ تاہم ان کی کتاب، افسانے کی حمایت میں، جو ۱۹۸۶ میں منظر عام پر آئی افسانے سے متعلق تنقید کی روایت کو آگے بڑھانے میں اس کتاب کو معاون نہ سمجھ کر مخالف تصور کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف پروفیسر وہاب اشرفی کا ذکر ضرروری ہے۔ انہوں نے نہ صرف تنقید سے خود کو وابستہ رکھا بلکہ اپنے ابتداری دنوں میں افسانے بھی لکھے۔ وہاب اشرفی نے افسانے سے متعلق بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کی سہیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری کے تعلق ایک اہم تنقیدی کتاب، سہیل عظیم آبادی اور ان کے افسانے، ہے جب کہ دوسری راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری ہے۔ تیسری اہم کتاب بہار میں اردو افسانہ نگاری ہے۔ اس علاوہ وہاب اشرفی کی کتاب، تاریخ ادب اردو جو تین جلدوں پر مشتمل ہے اس میں تقریباً تمام افسانہ نگاروں کے فکر وفن پر انہوں نے خامہ فرسائی کی ہے۔ ان کی معروف کتاب، آگہی کی منظر نامہ، بھی یقیناً قابل ذکر ہے جس میں ۵ مضامین افسانے سے متعلق شامل ہیں۔ وہاب شرفی کی افسانے سے متعلق تنقیدی خدمات کا جائزہ آئندہ باب میں تفصیل سے لیا جائے گا۔ یہاں

روایت کے تحت اختصار سے کام لیتے ہوئے اتنا عرض کرنا ہے کہ وہاب اشرفی کا انداز نقد جدا ہے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ ناقدین کسی بھی فنکار کے ڈانڈے مغرب سے ملانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہاب اشرفی سہیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ان کے مطالعے میں کچھ مغربی فنکار رہے ہوں گے لیکن انہوں نے ان سے فنی اکتساب نہیں کیا بلکہ وہ الگ کھڑے نظر آتے ہیں۔ گویا ان کی نظر میں یہ سہیل عظیم آبادی کی خامی نہیں بلکہ خوبی ہے۔

اردو افسانے کی تنقید کے حوالے سے ایک اہم نام انور سدید کا ہے۔ ان کی کتاب اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش ۱۹۷۳ میں منظر عام پر آئی جب کہ افسانے سے متعلق ان کی دوسری کتاب مختصر افسانہ عہد بہ عہد ۱۹۹۲ میں شائع ہوئی۔ یہ دونوں کتابیں اپنے باب میں اہم ہیں۔ اب تک کوئی ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی جس میں افسانوں میں گاؤں دیہات کی پیش کش کے حوالے سے اس تفصیل سے گفتگو کی گئی ہو۔ انور سدید نے اس میں موضوعاتی مطالعہ پیش کیا ہے اور مختلف افسانہ نگاروں کے یہاں اس کی خصوصیت کی بازیافت کی ہے۔ اس طرح مرزا حامد بیگ کی کتاب، افسانے کا منظر نامہ افسانے کی تنقید کی ایک اہم کڑی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۸۳ میں قارین کے ہاتھ میں پہنچی تھی۔ ان کی ایک اور کتاب، اردو افسانے کی روایت جو ۱۹۹۱ میں شائع ہوئی افسانے کی تنقید کو آگے بڑھائی ہے مرزا حامد بیگ کا رویہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں صاف صاف کہہ جاتے ہیں۔ صغیر افراہیم کی ایک کتاب اردو افسانہ: ترقی پسند تحریک سے قبل ۱۹۹۱ میں منظر عام پر آئی تھی۔ جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں ترقی پسند تحریک یعنی ۱۹۳۵ سے قبل کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ گویا یہ کتاب ابتدائی دور کی افسانہ نگاری پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کتاب پریم چند ایک نقیب، نثری داستان کا سفر، اردو فکشن تنقید اور تجزیہ، ان کی اہم تصنیفات ہیں جو ان کے تحقیقی اور تنقید ذہن کا پتہ دیتی ہیں۔ فکشن پر کام کرنے والے ناقدین میں صغیر افراہیم ایک اہم نام ہے۔ ان کے سلسلے میں وہاب اشرفی کی یہ رائے ان کی تخلیقی کاوش کا اندازہ لگانے میں معاون ہو سکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: تاریخ ادب اردو میں انہیں اس لئے جگہ دی جارہی ہے کہ یہ فکشن پر بطور خاص انہماک سے کام کررہے ہیں۔ اب تک ان کے تقریباً ۲۷ مضامین شائع ہو چکے ہیں جن میں اکثریت ناولوں اور افسانوں کے مطالعہ پر مبنی ہیں۔۔۔۔۔۔ صغیر افراہیم تحقیقی ذہن رکھتے ہیں لیکن ان کا تجزیاتی شعور بھی بیدار ہے۔ اس لحاظ سے ان کی کتابیں بہ یک

وقت تحقیق وتنقید کا ادغام پیش کرتی ہیں۔

وارث علوی اردو تنقید کا ایک معتبر نام ہے۔، جدید افسانہ اور اس کے مسائل ان کی ایک اہم تنقیدی کاوش ہے۔ یہ کتاب ۱۹۹۰ میں منظر عام پر آئی۔ وارث علوی کا انداز دوٹوک ہے ان کا اسلوب بھی کھرا ہے۔ نقد افسانہ کے حوالے سے ارتضیٰ کریم کا نام خصوصیت کا حامل ہے۔ موصوف فکشن کی تنقید پر مشتمل کئی کتابوں کے مصنف اوار مرتب ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی بے حد اہم کتاب اردو فکشن کی تنقید ہے اس کے علاوہ قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور جوگندر پال سے متعلق کتابیں ترتیب دی ہیں۔ اردو فکشن کی تنقید ایک وقیع کتاب ہے۔ یہ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں اردو فکشن کی تنقید کے آغاز وار تقا پر محنت صرف کی گئی ہے جب کہ دوسرے باب میں تمثیل پر تنقیدی سرمایہ، تیسرا داستان پر تنقیدی سرمایہ چوتھا ناول پر تنقیدی سرمایہ اور پانچواں افسانے پر تنقیدی سرمایہ ہے۔ اس کے بعد ایک بسیط اشاریہ ہے۔ میری غرض پانچویں باب افسانے پر تنقیدی سرمایہ سے ہے۔ ارتضیٰ کریم نے اردو افسانے کی تنقید پر مبنی نہ صرف کتابوں کا جائزہ لیا ہے، بلکہ اس تعلق سے لکھے گئے مختلف رسائل وجرائد میں مضامین کی تلاش وجستجو بھی ہے۔ جو بڑا کام ہے۔

آخر میں ایک اور اہم ناقد کی طرف ہماری نظر جا ٹھہری ہے۔ وہ ہیں ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی۔ فکشن کی تنقید کی موجودہ کھیپ شہاب ظفر اعظمی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ خصوصیت کے ساتھ فکشن کے نقاد ہیں۔ بہر کیف، جہاں فکشن میں کل ۱۷ مضامین شامل ہیں جن میں چھ مضامین افسانہ سے متعلق ہیں۔ ایک مضمون، گوپی چند نارنگ اور افسانے کی تنقید ہے جس میں موصوف نے نارنگ کی تنقید کا جائزہ بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ شہاب اعظمی کی یہ خوبی ہے کہ وہ اپنی کہنے کا ہنر جانتے ہیں جس کی وجہ سے ناگوار بات بھی گوارا ہو جاتی ہے۔ ان کا انداز نقد نہ تو ایسا ہے کہ پڑھنے والا گراں محسوس کرے اور صاحب کتاب برا مانے۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہوں اسے کہنے سے گریز کریں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ اس بنا پر نئے ناقدین میں وہ پسند کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کا انداز نقد درج ذیل اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے۔ گوپی چند نارنگ کی افسانے سے متعلق تنقید پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''پروفیسر نارنگ ایک ہمہ گیر اور کثیر الجہات شخصیت کا نام ہے۔ اردو تنقید کے

میدان میں بھی ان کی جہتیں مختلف ہیں جن میں اردو شاعری، اردو نثر، اسلوبیات ، ساختیات اور لسانیات کے ساتھ ان کا پسندیدہ میدان، اردو افسانہ، بھی رہا ہے ۔اردو تنقید کی تاریخ میں زیادہ تر شاعری کی تنقید سے ہی سروکار رکھا گیا ہے، یعنی ادب کے مطالعے میں شاعری کو بنیادی حیثیت حاصل رہی اور فکشن کو ثانوی مقام بھی مشکل سے دیا گیا۔اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ شاعری کی بہ نسبت فکشن کی تنقید زیادہ مشکل، پیچیدہ اور محنت طلب عمل ہے۔''

درج بالا سطور میں محسوس کیا جا سکتا ہے کہ شہاب ظفر اعظمی اگر اس بات کا گلہ کرے ہیں فکشن کو ثانوی مقام بھی مشکل دیا گیا تو اس کا جواز بھی فراہم کرتے ہیں شاید فکشن کی تنقید زیادہ مشکل کام ہے۔ان کا یہی انداز بیاں انہیں مقبول بھی بناتا ہے۔اس سلسلے میں ایک اور اقتباس ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔سید محمد اشرف کی افسانہ نگاری پر اپنی تنقیدی رائے پیش کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں:۔۔۔انہوں نے اپنے عہد، اپنے ماحول، اپنے عہد کے تضادات اور تصادمات کو ایک ایسے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے جس میں ان کی افسانوی انفرادیت کے ساتھ ساتھ افسانے کی نئی جمالیات بھی موجود ہے۔اس جمالیات میں قصہ گوئی ہی آخری منزل نہیں بلکہ منزل وہ ہے جب افسانہ نگار کائنات کو اپنے اندر محسوس کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے۔اس صلاحیت کے بعد ہی افسانہ نگار کائنات سے اس طرح ہم آہنگ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے بنیادی خیال کے اظہار کے لئے کائنات کی مختلف اشیاء و مظاہر کو جب اور جس طرح چاہتا ہے استعمال کر سکتا ہے۔اشرف اس منزل تک پہنچ گئے ہیں۔اس لئے لکڑ بگھا ہو یا کبھے کا ہرن، ہاتھی ہو یا گدھ، بڑے پل کی گھنٹیاں ہوں یا ببول کے کانٹے، قربانی کا جانور ہو یا اندھا اونٹ، جنگل ہو یا شہر، شجرہ ہو یا جنت ،طوفان ہو یا رنگ رائیگاں ہر شئے کو جیسے چاہتے ہیں جب چاہتے ہیں استعمال کرتے ہیں اور ان کے ذریعہ اپنی فکر اور اپنا بنیادی خیال پوری فنکاری اور قوت کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں گویا شہاب ظفر اعظمی اردو فکشن کے نئے ناقدین میں اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ان کی تنقید میں ٹھہراؤ اور استحکام ہے۔

☆☆☆